حقیقت زندگی

ڈاکٹر محمد حماد لکھوی *

انسان اس دنیا کے اندر ایک ایسی مخلوق ہے جس کا مقصد تخلیق اور مقصد زندگی بھی اس کے وجود کی طرح تمام مخلوقات سے افضل اور اشرف ہے۔ لہذا اس کا اس دنیا کے اندر مخصوص وقت کے لیے قیام بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ قیام دنیا کے لیے دیا گیا یہ وقت گزارنے کے لیے تمام عزو شرف کے باوجود اپنی راہیں انسان کو خود متعین کرنا پڑتی ہیں اور یہی اس کی وجہ امتیاز ہے۔ کیونکہ دوسری تمام مخلوقات اللہ کے دیئے ہوئے لگے بندھے نظام اور امر تکوینی کے تحت زندگی گزار کر عالم ابدیت کی طرف کوچ کر جاتی ہیں۔ نباتات، جمادات اور حیوانات سب کے سب متعین شدہ اصول و ضوابط کے تحت محض جبلت اور قانون فطرت کی رہنمائی میں کسی تبدیلی وارتقاء کے امکان کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ انسان کوئی دریا نہیں کہ زمین کے نشیب وفراز کے ساتھ اس کی راہیں خود بخود متعین ہو جاتی ہوں اور نہ یہ حیوانات کی طرح کوئی جانور ہے کہ اس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلت ہی کافی ہو۔ اور نہ ہی یہ عالم نباتات کی طرح ہے کہ قانون فطرت کے ذریعے ہی اس کی نشوونما، مقصد زندگی اور خطوط زندگی طے ہو جاتے ہوں۔ بلکہ انسان تو ایک ایسی ہستی ہے جس کی زندگی کے بہت سارے پہلو قوانین فطرت اور امر تکوینی کے تابع ہونے کے باوجود یہ فہم وشعور، ارادہ و اختیار اور قوت فیصلہ رکھتا ہے۔ اور اس طرح اپنی زندگی کی راہوں کو متعین کرتا ہے۔ اس کی فکری سمت اور عملی منہاج متعین کرنے کے لیے جس علم اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہ رہنمائی تنہا اس کی فطرت مہیا نہیں کر سکتی۔ نہ ہی صرف جبلت کے پاس اس کی دینوی واخروی زندگی کی پیچیدگیاں حل کرنے کا سامان ہے۔ بلکہ اس کی فکر کو صحیح اور عمل کو درست رکھنے کے لیے ایک واضح ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں انسانی افکار وخیالات بھی اس کی درست رہنمائی کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ مختلف شعبہ ہائے

---

* لیکچرار ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب، لاہور۔

زندگی کے بارے میں مختلف افکار، انسانی زندگی کے لیے جو کہ ایک وحدت ہے، کیسے رہنما اصول قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح تو انسانیت تضادات کا شکار ہو جائے گی۔ مختلف سمتوں اور جہتوں پر آگے بڑھنے سے انسانی زندگی میں انتشار اور اختلاف پیدا ہو جائے گا جو انسانی زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کردے گا اور اس طرح انسان اپنے مقصد زندگی سے کوسوں دور نکل جائے گا۔

انسانی زندگی بحیثیت مجموعی ایک کل ہے۔ جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے، اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ ایسا ربط جس کو توڑنا ممکن نہیں۔ ایک ہی روح ہے جو انسانی زندگی کے تمام اجزاء میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ سب اجزاء مل کر ہی وحدت بناتے ہیں جسے ہم انسانی زندگی کا نام دیتے ہیں۔ زندگی ایک وحدت ہونے کی وجہ سے انسان کو بہت سارے مقاصد زندگی نہیں بلکہ ایک ہی مقصد زندگی درکار ہے۔ اور ایک مقصد زندگی کے حصول کے لیے ایک ہی ایسا ضابطہ حیات اور فکری منہج درکار ہے جو اس کی فکر و عمل کی راہوں کا تعین کردے اور اس کے سارے شعبہ ہائے زندگی پر یکساں اثر انداز ہو سکے۔ ایسا ضابطہ صرف خالق کی طرف سے دیا گیا ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے خالق حقیقی نے کمال مہربانی کا معاملہ کرتے ہوئے ہمیں ایک ضابطہ حیات عطا فرمادیا ہے جو کہ ایک مربوط نظام ہے۔ جس کی ہر کڑی دوسری کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہے کہ اس کا ایک ایک حکم تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے اپنے اندر رہنمائی اور اثرات رکھتا ہے۔ اس ضابطے اور قانون کے سارے احکامات ہمہ جہت (Multi dimentional) ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کا صحیح رخ متعین کرتے ہوئے دوسرے تمام پہلو یا کوئی ایک پہلو نظر انداز ہو رہا ہو۔ الہامی ہدایات کا ہر حکم بیک وقت انفرادی، اجتماعی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی اور قانونی، غرض ہر پہلوئے حیات کا احاطہ کرتا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:۔

"انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تمدنی یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں بالکل الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی زندگی میں مختلف شعبوں کے درمیان امتیاز و تفریق ممکن نہیں۔ جب تک تمام شعبوں کو درست نہ کیا جائے اور تمام شعبوں میں یک رنگی اور ہم آہنگی نہ ہو اس وقت تک انسانی زندگی خوشحالی اور کامرانی سے ہم کنار

نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ آپ کا نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نصف پر مسکراہٹ نہ آئے۔ تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف معیشت یا سیاست کی تنظیم سے پوری زندگی سنور جائے۔ اور جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو بیک وقت مختلف منزلوں کی طرف سرگرم عمل کیا جاسکے''۔(۱۹)

انسان کے لیے اس کے خالق حقیقی نے ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات دے کر، جو اس کی زندگی کا بطور ایک وحدت کے پوری طرح احاطہ کرے، یہ وسیع وعریض کائنات اس کے حوالے کر دی ہے۔ جس میں وہ اپنے مالک کی طرف سے عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ اسی کردار کی بدولت ابدی زندگی میں اس کے انجام کا تعین ہوگا۔ لہذا انسانی زندگی کی حقیقت دراصل کائنات اور خدا کے ساتھ اس کے تعلق پر منحصر ہے۔ انسان کے کائنات اور خدا کے ساتھ تعلق کی نوعیت کے اختلاف سے انجام میں زمین وآسمان کا فرق پڑنے کا امکان ہے۔ لہذا قابل غور بات یہ ہے کہ انسان کا کائنات میں مقام کیا ہے؟ اور اپنے خالق کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اسی سے انسانی زندگی کی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوگی۔

کائنات اور حقیقت انسان

تخلیق انسانیت اور انسان کی حقیقت کے بارے میں دنیا میں مختلف قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ لیکن خالق حقیقی اور قادر مطلق نے اپنے کلام پاک میں خود تخلیق انسان کی حقیقت اور عمل تخلیق کے بارے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ قرآن پاک میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابتداء حضرت آدمؑ کا بت مٹی سے بنایا گیا پھر ان کی پسلی سے اماں حوا کو پیدا کیا گیا۔ بعدازاں ان دونوں سے عمل تخلیق کا ایک ایسا سلسلہ جاری کر دیا جو قیامت تک جاری رہے گ۔ مٹی کے بعد انسان حقیقت کے اعتبار سے تخلیق کے عمل سے پہلے ایک حقیر قطرہ آب ہے جو انتہائی ناقابل ذکر چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

هل اتی علی الا نسان حین من الادهر لم یکن شیا مذکورا۔(۲۰)

یقیناً انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔

اللہ تعالی نے اس طرح انسان کو اس کی حقیقت یاد دلائی ہے اور اسے ایک ایسے امر کی

طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی شعور ہو اور تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس کے اپنی حقیقت کے انکشاف کے ساتھ اپنے پیدا کرنے والے کے وجود اور اس کے علم وقدرت پر مکمل ایمان ویقین حاصل ہو جائے۔ سید قطب شہید مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

''ابتدائی استفہام تاکید وتقریر کے لیے ہے کہ انسان پر ایسا وقت ضرور گزرا ہے۔۔۔۔ یہ سوال انسان کو اپنی تخلیق سے پہلے کی حالت پر توجہ دلاتا ہے کہ وہ بالکل غیر مذکور چیز تھا۔ معدوم تھا۔ کائنات موجود تھی، اس کی ساری رونقیں موجود تھیں مگر وہ غیر موجود تھا۔ پھر غور کرنا لازم ہے کہ اس کی تخلیق کی ابتداء کیسے ہوئی؟ پانی کی ایک بوند تھی جس کا ایک حصہ دوسری بوند سے جا ملا اور ایک نئے انسان کی تخلیق کا سامان بہم ہو گیا۔ سوچو کہ یہ کیوں ہوا؟ کیا اس پیدائش کے پیچھے کوئی مقصد کارفرمانہ تھا؟ انسانی تخلیق کے لیے حالات استوار ہوئے، ماحول بنا ایک اندھیر کوٹھڑی میں اس پر کئی دور گزرے۔ تب وہ اس قابل ہوا کی ایک بے شعور ادراک بچے کی صورت میں اس جہان میں قدم رکھے۔ پھر بے شمار ساز وسامان اس کی پرورش کے ہوئے، تب کہیں جا کر وہ ''انسان'' بنا''۔(۲۱)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی حقیقت یاد دلانے کے لیے عمل تخلیق کی وضاحت اس طرح فرمائی:۔

فانا خلقنكم من تراب ثم من نطفة ثم من علقه ثم من مضغة مخلقة و غير مخلقة لنبين لكم و نقر في الارحام ما نشاء الى اجل مسمى ثم نخرجكم طفلا ثم لتبلغوا اشد كم و منكم من يتوفى و منكم من يرد الى ارذل العمر لكيلا يعلم من بعد علم شيئا۔(۲۲)

اے بنی نوع انسان! (ذرا سوچو کہ) بیشک ہم نے تمہیں مٹی سے تخلیق کیا، پھر قطرہ آب سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر پوری اور ادھوری بنی ہوئی (صورت یافتہ اور ناصورت یافتہ) گوشت (کی بوٹی) سے پیدا کیا (یہ بیان اس لیے کہ) تاکہ تم پر اپنی حقیقت ظاہر ہو۔ ہم جس قطرہ آب کو چاہیں ایک مقررہ وقت تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تمہیں ایک بچہ بنا کر منصۂ شہود میں لاتے ہیں (پھر نظام ربوبیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ) تم بھرپور جوانی کو پہنچو۔ پھر اس کے بعد تم میں

تے کچھ مر جاتے ہیں اور تم میں سے کئی بدترین عمر کو پہنچ جاتے ہیں جب یہ سمجھ بوجھ کا ایک معیار حاصل کر لینے کے بعد نا سمجھ بن جاتا ہے۔

انسانی عمل تخلیق کے لطیف نقاط کے بیان کرنے اور انتہائی ابتدائی مراحل کا ان الفاظ میں تذکرہ کرنے کا اس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں کہ انسان اپنی اوقات کو پہچانے۔ اور اس کائنات کے اندر اپنی حیثیت کا اندازہ کرے کہ حقیر مٹی سے اس کا خمیر اٹھانے کے بعد انتہائی حقیر پانی کی ایک بوند سے اس کو تخلیق کیا گیا۔ یعنی انسان اگر اپنی ابتداء کی طرف نگاہ دوڑائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتنی عظیم کائنات کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے قرآن پاک میں بار بار انسان کو اپنی پیدائش کے مختلف مراحل یاد کرائے ہیں تاکہ بڑی بڑی مخلوقات اور عظمت کائنات کے مقابلہ میں انسان کو اپنی ناتوانی کا اندازہ ہو سکے۔ پھر اگر انسان اپنی پیدائش سے عدم توجہی بھی برتے اور صرف اپنی موجودہ (بھرپور توانائی والی) زندگی کو ہی مدنظر رکھے تو بھی قوت، حجم، جسامت، سختی، شدت اور طوالت عمر کے اعتبار سے بہت ساری مخلوقات سے یہ کمزور واقع ہوا ہے۔ مثلاً پہاڑوں کو دیکھیے تو جسامت اور سختی ناقابل اندازہ حد تک انسان سے بڑھ کر ہے۔ دریاؤں، سمندروں کی بے اندازہ گہرائیاں اور ٹھاٹھیں مارتی موجوں سے آراستہ، خوف میں مبتلا کر دینے والے پانیوں کے مقابلے میں انسان کا وجود بہت معمولی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے طاقتور اور خونخوار درندے بیک وقت کئی انسانوں کو چیر پھاڑ کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غرضیکہ بے شمار مخلوقات ایسی ہیں کہ بظاہر انسان ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس کائنات کی وسعت کا اندازہ کیجیے۔ نباتات، جمادات اور حیوانات میں سے انسان سے بڑھ کر جتنی مخلوقات ہیں وہ تو اس زمین پر موجود ہیں، یہ زمین خود کیا ہے۔ ایک بہت بڑے نظام شمسی کا ایک چھوٹا سا جزو۔ پھر اس سے بڑھ کر نظام شمسی کے علاوہ اس کائنات کے اندر اتنی بڑی بڑی ستاروں کی کہکشائیں موجود ہیں کہ ایک ایک کہکشاں کھربوں ستاروں پر مشتمل اور ایک ایک ستارہ سورج سے کئی گنا بڑا ہے۔ مولانا وحید الدین خان کسی انگریزی اخبار کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:-

''انسان دیکھتا ہے کہ وہ ایک لامحدود کائنات میں ہے۔ اس کائنات میں تقریباً ایک

کھرب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں لگ بھگ ایک کھرب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں اور ہر ستارہ دوسرے ستارہ سے اتنے فاصلے پر ہے۔ جیسے بحرالکاہل کے لق ودق سمندر میں چند کشتیاں ایک دوسرے سے بہت دور تیر رہی ہوں۔ عظیم کائنات میں پھیلے ہوئے ستاروں کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہر ستارے کا کوئی یک لفظی نام رکھا جائے اور کوئی ان ناموں کو بولنا شروع کرے تو صرف ناموں کو دہرانے کے لیے تین سو کھرب سال کی مدت درکار ہوگی۔ اس ناقابل قیاس حد تک عظیم کائنات میں انسان سب سے زیادہ حقیر مخلوق ہے۔ وہ کائناتی نقشہ میں ان چھوٹے جزیزوں سے بھی کم ہے جو بہت چھوٹے ہونے کی وجہ سے عام طور پر دنیا کے نقشوں میں دکھائی نہیں دیتے''۔(۲۳)

یعنی کائنات اس حد تک وسیع وعریض ہے کہ اس کے مقابلے میں زمین کی حیثیت ایک ریت کے ذرے کے برابر بنتی ہے۔ پھر اس میں حضرت انسان اپنی حیثیت کا انداز کرلے کہ اس ریت کے ذرے (زمین) کے مقابلے میں یہ کس حیثیت اور مقام کا حامل ہے؟ اور اتنی بڑی کائنات میں کتنی قوت اور صلاحیت رکھتا ہے؟ اس حوالے سے دیکھا جائے تو انسانی وجود کو اتنی خوفناک حد تک بڑی کائنات کے ساتھ شاید کوئی نسبت ہی نہ دی جاسکے۔ کہ اس کی حیثیت ایک ریت کے ذرے کے برابر بھی نہیں بنتی۔ یہ کمزور وناتواں وجود انسانی اگر زمین سے بڑھ کر پوری کائنات کے متعلق نہ بھی سوچے تو بھی صرف زمینی مخلوقات کا مقابلہ کرنا ہی اس کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:-

واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ ، فلما نجا کم الی البر اعرضتم و کان الا نسان کفورا. افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجد و الکم و کیلا. ام امنتم ان یعید کم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفامن الریح فیغر قکم بما کفرتم ثم لا تجد و ا لکم علینا بہ تبیعا.(۲۴)

جب کبھی سمندر میں تم پر طوفان کی مصیبت آئی تو تم اپنے سب معبودان باطل کو بھول گئے اور اس وقت خدا ہی یاد آیا۔ پھر جب اس نے تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیا تو تم پھر اعراض کی روش پر اتر آئے۔ انسان واقعی بڑا نہ شکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہوگئے ہو کہ خدا تم کو زمین میں

دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کوئی اپنا مددگار نہ پاؤ۔

کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا جھکڑ بھیج دے جو تمہیں تمہاری نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ۔

گویا انسان کو اس جانب متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تمام نباتات، جمادات اور حیوانات اگر انسان کی تباہی پر تل جائیں تو پھر انسان کو اس کے خالق حقیقی کے علاوہ کوئی ان سے بچانے والا نہیں۔ کیونکہ انسان اپنے وجود کے اعتبار سے ایک انتہائی کمزور ہستی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وخلق الانسان ضعیفا (۲۵)

اور انسان خلقی لحاظ سے ضعیف (کمزور پیدا ہوا) ہے۔

سید مودودیؒ نے اس کائنات میں انسان کی کمزوری اور ناتوانی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

''اسے (انسان کو) اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت کو تو دیکھ! ایک نجس اور حقیر پانی کا قطرہ جو رحم مادر میں مختلف قسم کی نجاستوں سے پرورش پا کر گوشت کا ایک لوتھڑا بنتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ہی نہ ڈالے اور وہ یونہی غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے۔ اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس میں اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔ خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، طاقتور اور قادر ہوتا ہے پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ تیرا علم نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے اور آخر کار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ مال، اولاد، عزیز، دوست اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی

اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے۔ تجھ سے بالاتر ایک قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان، جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے، نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کر لے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری اپنی اصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی ساز و سامان مہیا کر لے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں''۔(۲۶)

انسان کی تمام تر خلقی کمزوری، بے بضاعتی، کم مائیگی، اور اتنی وسیع و عریض کائنات کے مقابلے میں انتہائی اصغر وجود کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اتنے کمزور وجود کو سب سے اعلیٰ اور اشرف مخلوق قرار دیا ہے۔ بلکہ محض لفظی شرف و عزت کی بجائے پوری کائنات کی منہ زوریوں کو لگام دیتے ہوئے اس کو انسان کے لیے عملاً مسخر بھی کر دیا گیا ہے۔ کائنات کی ایک ایک مخلوق اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کی صلاحیتوں کے باوجود انسانیت کی خدمت پر مامور ہے۔ فلک بوس پہاڑوں، لق و دق صحراؤں، وسیع و عریض خوفناک سمندروں اور دریاؤں اور خونخوار درندوں تک نے انسان کے سامنے خدمت کے لیے گردن جھکا دی ہے۔ جن کی طاقت و قوت کے ساتھ انسانی توانائی اور صلاحیتوں کو کوئی نسبت ہی نہ تھی ان تمام چیزوں کا انسان حاکم قرار پایا ہے۔ اور اسے ساری کائنات میں سے معزز ترین ہستی گردانا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ولقد کرمنا بنی آدم و حملنهم فی البر و البحر و رزقنهم من الطیبت و فضلنهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔(۲۷)

اور تحقیق ہم نے اولاد آدم کو کائنات ہستی میں بے انتہا عزت بخشی اور بحر و بر میں ان کو سواریاں مہیا کیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور اپنی کثیر مخلوقات پر اسے (کما حقہ) فضیلت عطا کر دی ہے۔

باری تعالیٰ کے اس فرمان میں انسان کی عزت و تکریم کا تذکرہ کر کے ایک نئی طرح سے اس کو اپنی حقیقت، یاد دلائی جا رہی ہے۔ انسان کی طبعی کمزوریوں کا تذکرہ اور پھر ساری مخلوقات پر اس کی فضیلت کا ذکر دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا مقام اس دنیا میں نہایت اہم ہے۔ اور باوجود کمزور اور ناتواں ہونے کے اس کو اشرف المخلوقات قرار دینا، اس کی، کائنات کے اندر خصوصی حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ اسی خصوصی حیثیت کی وجہ سے ہی پوری کائنات اس کے کنٹرول میں دی جا رہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے، بحر و بر کو جو اس کے لیے مسخر کیا ہے، خشکی و تری دونوں میں اس کے لیے سواری کا جو انتظام کیا ہے، اس کو جو پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اس کو اپنی بہت سی مخلوقات پر جو فضیلت عطا کی ہے۔ تو انسان کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کا حق پہچانے اور ان نعمتوں کی وجہ سے کسی غرور اور تکبر میں مبتلا ہونے کی بجائے اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنے اور کائنات کے اندر اپنے خصوصی مقام کا پاس کرے۔ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ نے بنی آدم کو مختلف حیثیات سے ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں۔ مثلاً حسن صورت، اعتدال جسم، اعتدال مزاج، اعتدال قد و قامت جو انسان کو عطا ہوا ہے کسی دوسرے حیوان میں نہیں، اس کے علاوہ عقل و شعور میں اس کو خاص امتیاز بخشا گیا ہے جس کے ذریعہ وہ تمام کائنات علویہ اور سفلیہ سے اپنے کام نکالتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت بخشی ہے کہ مخلوقات الہیہ سے ایسے مرکبات و مصنوعات تیار کرے جو اس کے رہنے سہنے اور نقل و حرکت اور طعام و لباس میں اس کے مختلف کام آئیں۔۔۔ سب سے بڑی فضیلت عقل و شعور کی ہے جس سے وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچانے اور اس کی مرضی اور نامرضی کو معلوم کر کے مرضیات کا اتباع کرے اور نامرضیات سے پرہیز کرے"۔ (۲۸)

بعض اہل علم نے تکریم اور تفضیل میں فرق کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ وجود کے اعتبار سے انسان کو انتہائی کمزور اور ناتواں مخلوق ہونے کے باوجود شکل وصورت اور قامت واعتدال کے علاوہ عقل وشعور اور فہم و ارادہ کی نعمت سے نوازنا تکریم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ان دی گئی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے منصب اور مقام کے مطابق اعمال سرانجام دینا تفضیل ہے جو کہ ایک کسبی چیز ہے۔علامہ محمود آلوسی مذکورہ بالا آیات تکریم انسانیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

" انہ تعالیٰ قال اولاً (ولقد کرمنا بنی آدم) و قال سبحانہ ھنا (و فضلنا ھم) فلا بد من فرق بین التکریم و التفضیل لئلا یلزم التکرار. و الا قرب فی ذلک ان یقال: انہ تعالیٰ فضل الا نسان علی سائر الحیوانات بامور خلقیۃ طبیعیۃ ذاتیۃ مثل العقل و النطق و الخط و الصورۃ الحسنۃ و القامۃ المدیدۃ ثم انہ عزوجل عرضہ لواسطۃ العقل و افھم لا کتساب العقائد الحقۃ و الا خلاق الفاضلہ فالا ول ھو التکریم و الثانی ھو التفضیل فکانہ قیل فضلنا ھم بالتعریض لا کتساب ما فیہ النجاۃ و الزلفی بواسطۃ ما کرمنا ھم بہ من مبادی ذلک فعلیھم ان یشکروا و یعرفوا ما خلق لھم لما خلق لہ "۔(۲۹)

اسلام نے انسان کو انسان کی حیثیت سے سامنے رکھا ہے اور اس کے فعال کردار حیات کو تسلیم کیا ہے۔اسلام نے انسان کو یہ شرف عطا کیا ہے کہ وہ معقول حدود میں رہتے ہوئے اس عمل حیات کو بھرپور طریقے سے انجام دے۔یہ نہ تو اپنے آپ کو اتنا کمزور، حقیر و ذلیل خیال کرے کہ کائنات کی دوسری چیزوں کے سامنے جھکنا شروع کردے اور نہ ہی اپنے آپ کو اس کائنات کا مالک سمجھنا شروع کردے۔اسلام انسان کا ایک انتہائی معتدلانہ تصور پیش کرتا ہے۔یہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے، انسان کائنات کے لیے نہیں بنایا گیا۔معروف سکالر ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی کائنات کے حوالے سے انسان کے حقیقی مقام کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:۔

" Man has been created in the best make gifted with enormous capabilities for progress and perfection. He has to

serve the Creator and to fulfill his duties towards his Lord and towards his fellow beings. Man is far more dignified than to bow before inanimate objects as stones, idols, sun, moon, stars, trees etc. The real dignity of man in the conquest of nature and not bowing before the elements of nature."(۳۰)

انسان کواس لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ دنیا و مافیا کیلیے استعمال ہو جائے اور اپنی ہستی کو ہی گم کر بیٹھے۔ بلکہ انسان کو اعتدال و توازن کیساتھ دنیا کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ تا کہ یہ دنیا اس کے حقیقی مقاصد کے حصول کے لیے معاون بن جائے۔ انسان اور کائنات کے اعتدال پر مبنی اس تعلق کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت سید مودودیؒ نے اس طرح کی ہے:۔

''نہ تو دنیا کوئی ترک اور نفر کے قابل چیز ہے اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریفتہ ہو اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے۔ نہ وہ سراسر کون ہے نہ سراسر فساد۔ نہ اس سے اجتناب درست ہے اور نہ اس میں کلی انہماک صحیح۔ نہ وہ بالکل نجاست و آلودگی ہے اور نہ تمام تر پاکیزگی و طہارت۔ پھر اس دنیا سے انسان کا تعلق نہ اس قسم کا ہے جیسا ایک بادشاہ کا اپنی مملکت سے ہوتا ہے اور نہ اس قسم کا جیسا ایک قیدی کا اپنے قید خانے سے۔ نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ دنیا کی ہر قوت اس کی مسجود ہو اور نہ اتنا غالب و قاہر کہ وہ دنیا کی ہر شے کا مسجود بن جائے۔ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز ہی نہ ہو اور نہ اتنا طاقتور کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ نہ وہ عالم ہستی کا مطلق العنان فرمانروا ہے اور نہ کروڑوں آقاؤں کا بیچارہ غلام۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ان مختلف و نہایات کے درمیان ایک متوسط حالت ہے''۔(۳۱)

یعنی کائنات کے اندر انسان کی کمزور اور قوت و اختیار دونوں اس کے وجود کے اعتدال و توازن کے لیے ضروری ہیں۔ افراط و تفریط کے درمیان وسط زریں، انسان کا اس کائنات میں اصل مقام ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اس کائنات میں اولاً انسان کی کمزوری اور پھر تکریم و تفضیل کے فلسفے کی درج ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

''انسان کی بے بسی اور اس کی حیثیت بیان کر کے بتایا ہے کہ اسے مغرور، متکبر، غیر ذمہ دار اور ظالم نہیں بننا چاہیے۔ بلکہ اپنی کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اعتدال پر رہنا چاہیے۔ اسلام انسان کے مساوی مقام کو اس طرح متعین کرتا ہے کہ اسے کائنات سے مرغوب ہونے کی ضرورت ہے نہ اپنے آپ کو ایسی بلند ہستی تصور کر لینے کی کہ خدائی احکام ہی سے روگردانی کرنے لگے۔ ان دو پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد قرآن حکیم عظمت انسانی کا وہ مثبت تصور بھی دیتا ہے جس میں سے اس کی صحیح حیثیت اور مقام کا تعین ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اول و آخر انسان ہے اور انسان رہنے ہی میں اس کی عظمت ہے۔ اگر وہ انسانی مرتبہ کو پہچانے اور اس پر قائم رہے تو اللہ کے بعد کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ اس طرح اس نے دو مختلف پہلوؤں سے عظمت انسان واضح کی''۔ (۳۲)

دراصل اس کائنات میں انسانی عظمت کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کی عظمت کا ذاتی پہلو ہے اور دوسرا اضافی۔ ذاتی پہلو کے اعتبار سے انسان کی شخصیت کو اس کائنات میں نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ اس کو ایسی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو اس کی مختار حیثیت کی طرف نشاندہی کرتی ہیں۔ اضافی پہلو عظمت انسانی کا یہ ہے کہ انسان کا اس کائنات میں رہتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے ساتھ نیابت کا تعلق ہے۔ اور یہ اپنے خالق کے ساتھ اپنے اس تعلق کی بنا پر دوسری تمام مخلوقات سے اونچا اور افضل مقام رکھتا ہے۔

انسان اور اللہ کا تعلق

اسلام نے انسان پر ایک بہت بڑا احسان کیا کہ اس کو ایک خالق و مالک اور مدبر کائنات خدا کا تصور دیا۔ اس تصور نے در در پر جھکی ہوئی انسان کی گردن کو سیدھا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے انسان دنیا کی بہت سی چیزوں کا اپنے آپ کو محتاج سمجھتا تھا۔ اس لیے ان کے آگے جھکنا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام نے آ کر اسے بتایا کہ دنیا کی تمام اشیاء مخلوق ہیں۔ جن کا بنانے والا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ لہذا مخلوق کے سامنے نیازمندی اور عاجزی و انکساری کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی یہ انسان کا مقام و مرتبہ ہے۔ بلکہ اس کی بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اگر یہ اس تعلق کی

حقیقت کو جاننے اور اس کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو دنیا میں بھی اس کی زندگی میں اعتدال و توازن پیدا ہو جائے گا اور اخروی زندگی میں بھی کامیابی و کامرانی سے شادکام ہو جائے گا۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ انسان اور خدا کے اس تعلق کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''وہ انسان جو شعر و فلسفہ، اور سیاست و معاشرت کے باب میں بڑے بڑے دعوے کرتا ہے اور بڑی خوش فہمیاں رکھتا ہے، جس نے بار ہا قوموں اور ملکوں کو غلام بنایا ہے، جس نے اپنے اپنے ہنر سے ٹھوس پتھروں کو مہکتے اور لہلہاتے پھولوں میں بدل دیا ہے، اور پہاڑوں کے سینوں سے نہریں نکالی ہیں اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ یہی انسان ایسی حقیر و ذلیل چیزوں کو بھی سجدہ کرتا رہا ہے، جو نہ نفع دے سکتی ہیں، نہ نقصان، نہ کسی کو کچھ دے سکتی ہیں اور نہ اس سے روک سکتی ہیں۔

وان یسلبھم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب (۳۳)

اور اگر مکھی ان کے سامنے سے کچھ چھین لے جائے تو اس سے چھڑا تک نہیں سکتے۔ عابد و معبود دونوں ہی بے دست و پا ہیں۔

یہ انسان ایسی اشیاء کے سامنے جھکتا تھا، اور ان سے ڈرتا یا ان سے خیر کی امید رکھتا تھا، جنہیں اس نے خود بنایا تھا۔ انسان صرف پہاڑوں، نہروں، درختوں، جانوروں، ارواح و شیاطین اور مظاہر فطرت ہی کو سجدہ نہیں کرتا تھا، اس نے حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں تک کو سجدہ کیا اور اپنی پوری زندگی وسوسوں اور اندیشوں، اوہام و تخیلات اور امیدوں اور آرزوؤں کے درمیان گزار دی۔ جس کے فطری نتیجے میں اس کے اندر بزدلی و کمزوری، فکری انارکی، نفسیاتی اضطراب، بے اطمینانی و بے قراری جیسی بیماریوں نے گھر کر لیا۔۔۔۔قرآن اور رسالت محمدیہ نے (آکر) یہ اعلان کیا کہ یہ دنیا بلا حاکم و مالک کے یا کئی حاکموں کی مشترکہ ملکیت نہیں، بلکہ اس کا ایک ہی بادشاہ ہے، جو اس کا خالق و صانع، اور اس کا حاکم و مدبر ہے، اور خلق و امر کا اختیار اسی کو ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اسی کے امر اور قدرت کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ اور اس (تمام دنیا) کے وجود کی علت حقیقی اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے۔ اس طرح یہ کائنات اپنی تخلیق و وجود میں اس کے ماتحت اور تابع فرمان

ہے۔اس لیے ان مخلوقات کو، جو ارادہ و اختیار رکھتی ہیں، اس کا فرمان بردار ہونا چاہیے۔انسان پر اس عقیدہ کا پہلا ذہنی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ پوری دنیا ایک مرکزیت اور متحدہ نظام کے تابع ہے اور انسان اس کے منتشر اجزاء میں ایک ربط اور قانونی وحدت محسوس کرتا ہے۔ پھر اس عقیدہ کی بدولت زندگی کی مکمل تعبیر کر سکتا اور کائنات کے بارے میں حکمت و بصیرت کے ساتھ کوئی رائے قائم کر سکتا ہے'۔(۳۴)

انسان کو یہ بتا دیا گیا کہ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے، سب ایک خدا کی مخلوق ہے۔ اور اسی لیے اس بات پر بھی یقین ضروری ہے کہ اس کائنات میں ذرے ذرے کی حرکات و سکنات کا انحصار بھی اس ذات باری تعالیٰ کی مرضی اور تدبیر پر ہے۔ اس کارخانہ قدرت و تدبیر میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ کیا انسان بھی دوسری تمام مخلوقات کی طرح خالق کے امر تکوینی کے تابع ہے؟

اس سوال کا جواب انسانی عقل ہمیشہ سے مختلف طرح سے دیتی چلی آرہی ہے۔ وجود کے اعتبار سے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلے میں کائنات کی بڑی بڑی اشیاء جو طاقت و شوکت میں انسان سے کہیں بڑھ کر ہیں، کو دیکھتے ہوئے انسان کو انتہائی حقیر ہستی کی حیثیت دی گئی۔ان بڑی بڑی اشیائے کائنات کو قوت و قابلیت کے اعتبار سے خود مختار سمجھ لیا گیا جو انسان کو نفع اور نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس طرح انسان کا اس دنیا میں عزت و شرف کے مقام کی بجائے انتہائی ادنیٰ اور کمزور تصور قائم ہو گیا۔ انسان مخلوقات کائنات کے مقابلے میں تو حقیر سمجھا ہی گیا اسے بجائے خود بھی ایک عالمگیر فطری قانون میں جکڑا ہوا محسوس کر کے ایک مجبور محض ہستی تسلیم کر لیا گیا کہ نفسیاتی، فکری اور عملی طور پر انسان ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہے۔ یہ اس قانون کے خلاف نہ تو کچھ سوچ سکتا ہے، نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی حرکت ہی کرنے پر قادر ہے۔ بلکہ دوسری تمام مخلوقات کی طرح امر تکوینی کا پابند ہے۔اس کے برعکس انسان کے بارے میں ایک تصور یہ بھی قائم کیا گیا کہ انسان ایک صاحب ارادہ خود مختار ہستی ہے۔ اس کے اوپر نہ کسی اعلیٰ ترین ہستی کی حکمرانی ہے اور نہ یہ کسی بالاتر ارادہ کا تابع یا کسی اعلیٰ طاقت کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ بلکہ دنیا کی سب چیزیں اس کیلیے مسخر ہیں اور یہ اس دنیا کا مالک ہے۔ اگر کسی حوالے سے اس پر کوئی پابندی نظر آتی ہے، تو وہ صرف انفرادی طور پر ہے اور اس نے خود اپنے اوپر لاگو کی ہے تاکہ اپنے افعال و اعمال میں ایک نظم و

ضبط پیدا کرے۔ بحیثیت مجموعی انسان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

انسان کے ارادہ واختیار، اس کائنات میں اس کی حیثیت اور اس کے خالق حقیقی کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں مذکورہ بالا تصورات کی افراط وتفریط اسلام نے ایک ایک کر کے ختم کر دی اور انسان کو اس دنیا میں اس کا حقیقی مرتبہ یاد دلایا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی بنیادوں اور تفصیلات وتقاضا جات کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس کو بتایا گیا کہ انسان نہ تو اس دنیا میں اتنا اعلیٰ و برتر مقام رکھتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو اس پوری کائنات کا مالک سمجھنے لگے اور نہ ہی یہ اتنا حقیر اور پست ذلیل ہے کہ دوسری تمام اشیائے کائنات یا بڑی بڑی مخلوقات اس پر حاوی ہو جائیں اور اس کا نفع ونقصان ان بڑی طاقتوں کے مرہون منت ہو۔ بلکہ انسان کا حقیقی مقام ومرتبہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ سید مودودیؒ اسلامی تصور زندگی اور انسان اور اللہ کے رشتہ وتعلق کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

''وہ (اسلام) یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے کہ تو عام مخلوقات کی طرح نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رب العالمین کا ذمہ دار وائسرائے ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو تیرے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ تو سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے۔ سب کا فرماں روا اور ایک کا تابع فرمان ہے۔ تجھے تمام مخلوقات پر عزت وشرف حاصل ہے۔ مگر عزت کا استحقاق تجھے اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تو اس کا مطیع اور فرمانبردار ہو اور اس کے احکام کا اتباع کرے جس نے تجھے نیابت کا منصب عطا کر کے دنیا پر شرف بخشا ہے۔ دنیا میں تو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اس کو برتے اور اس میں تصرف کرے۔ پھر تو اس دنیا کی زندگی میں جس طرح صحیح یا غلط عمل کرے گا اس پر وہ اچھے یا برے نتائج مرتب ہوں گے جنہیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ لہذا دنیوی زندگی کی اس تھوڑی سی مدت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسؤلیت کا ہر لمحہ احساس رہنا چاہیے اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا چاہیے کہ جو چیزیں رب العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری امانت میں دی ہیں، ان سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا''۔(۳۵)

جواب دہی کا یہ تصور دراصل انسان کے مقام ومرتبہ کا تقاضا تھا۔ اور اس کے مقصد تخلیق کے ساتھ اس کا براہ راست تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب اس مخلوق (انسان) کی تخلیق ہی اپنے نائب

کے طور پر کی اور اپنی نیابت اور خلافت کی امانت اس کے سپرد کی تو اس کے مرتبے کی مناسبت سے اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم بھی عطا فرمایا اور اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی۔ پھر فرشتوں جیسی ملکوتی مخلوق سے اس خاکی کو تعظیما سجدہ بھی کروایا اور جس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا، اس (ابلیس) کو اس جرم میں ملعون اور اور راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا اور بعدازاں پورے اعزاز کے ساتھ مٹی کے اس پتلے انسان کو زمین میں اپنی نیابت کے عظیم مقام و مرتبہ پر سرفراز فرمایا۔ نیابت کے مقام کا تقاضا ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے، اس کی ہدایات پر عمل کرے اور آقا کی سپرد کردہ امانت میں خیانت نہ کرے، اس کے احکام سے سرمو انحراف نہ کرے۔ وگرنہ وہ سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ آقا کو حق حاصل ہے کہ وہ دی گئی امانت کے بارے میں سوال کرے۔ کیونکہ انسان کو اس دنیا کا مالک نہیں، نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ نائب کے پاس قوت و اختیار آقا کا عطا کردہ ہوتا ہے جس کے استعمال اور تصرف کے بارے میں اسے پائی پائی کا حساب دینا پڑتا ہے۔ انسان کے منصب نیابت کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے قرآن پاک کی وہ آیات ملاحظہ ہوں جن میں منصب نیابت عطا کرنے کے بارے میں فرشتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اولین گفتگو شامل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة. قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك. قال انى اعلم مالا تعلمون. و علم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم على الملئكة فقال انبئونى باسماء هؤلاء ان كنتم صدقين قالو سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم . قال يادم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انى اعلم غيب السموت والارض واعلم ما تبدون و ما كنتم تكتمون۔(٣٦)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) مقرر کرنے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو اس کو زمین میں نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح اور تیری تقدیس

کرتے ہیں (یہ شرف نیابت تو ہمیں عطا ہونا چاہیے) اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور پھر اس (اللہ تعالیٰ) نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر (تم اپنے دعوے میں) سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا تیری ذات پاک ہے، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے، تو ہی علم رکھنے والا اور حکمت کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب آدم نے ان کو ان اشیا کے نام بتائے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں۔

آدم کی پیدائش اور اس کو خلیفۃ اللہ علی الارض کے مقام پر فائز کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی اس اولین گفتگو سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کو نیابت و خلافت کا منصب عطا کرتے ہوئے زمین میں بہت سارے اختیارات تفویض کیے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیگر تمام مخلوقات کے برعکس اس مخلوق (انسان) کو ارادہ و اختیار، فہم و شعور اور انتخاب کی آزادی عطا کی جا رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ فکر و عمل کی آزادی کے ساتھ ساتھ اسے علم و عرفان کی وہ نعمت دی جا رہی ہے جسے وہ تسخیر کائنات کے لیے استعمال کر سکے۔ اور تمام اشیائے کائنات کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال میں لائے۔ فرشتے اس منصب کے لیے موزوں نہ تھے کیونکہ وہ معصوم تھے۔ یہ منصب تو انسان ہی کے لائق تھا جس کو اشیا کے ناموں اور خواص سے اور زمین کے جملہ امور و معاملات سے باخبر کر دیا گیا تھا۔ یہ بات تو اس وقت ثابت ہو گئی تھی جب فرشتے اشیاء کے نام نہ بتا سکے اور انسان نے یہ کام کر دکھایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف معصومیت اور تقویٰ ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر کسی کو اتنا بڑا منصب عطا کیا جا سکے۔ اس مقام کے لیے تو معرفت اشیاء فیصلے کی طاقت اور پرکھنے کی قوت درکار تھی۔ بالفاظ دیگر فرشتوں کے نزدیک جو چیز فتنہ و فساد برپا کرنے اور خون بہانے کا باعث ہو سکتی تھی، وہی چیز (یعنی فکر و عمل کی آزادی) اس منصب خلافت کے لیے بہت اہم قرار دی گئی۔ یہ منصب صرف ایسی مخلوق کو دیا جا سکتا تھا جس کو نیکی، بدی، صحیح اور غلط میں انتخاب کی آزادی حاصل ہو اور وہ اپنی مرضی سے زمین پر عدل اور حق قائم کرے اور برائی کا راستہ اختیار نہ کرنے پر خدا کی خوشنودی اور

رضا کا مستحق ٹھہرے۔ امین احسن اصلاحی مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے اس کو انسان نے اٹھالیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہوتا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب ہوتا ہے نہ غیر حاضر، آسمان و زمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے کیا معنی؟ یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پا کر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمران کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی ایک شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمران کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرنا تھا''۔(۳۷)

منصب نیابت، یہ اقتدار و اختیار اور آزادی دراصل انسان کو ایک امتحان کے طور پر عطا کی گئی اور انسان ہی اس مقام و مرتبے اور آزمائش و امتحان کے لیے موزوں تھا۔ تخلیق آدم کے بارے میں اللہ اور فرشتوں کے مکالمے سے معلوم ہوتا ہے کہ، انسان کی وجہ تخلیق ہی اس کو نیابت و خلافت عطا کر کے اس کا امتحان کرنا تھا۔ فرشتوں کی وجہ تخلیق یہ نہ تھی اور نہ ہی وہ اس مقام و مرتبہ کے اہل تھے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے جواب سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انسانوں اور فرشتوں کے کاموں کی نوعیت مختلف ہو گی کیونکہ انسان نہ صرف اختیار کی آزادی کو استعمال کر سکے گا بلکہ قوانین فطرت کو مسخر بھی کر سکے گا اور انہیں اپنے لیے فائدہ مند بنا سکے گا اور ان امور میں اسے مکمل آزادی حاصل ہو گی۔

اپنے حواس، اپنی صلاحیتوں اور مختلف ذرائع کے استعمال میں بھی مکمل طور پر آزاد ہوگا، جس طرح
چاہے گا استعمال کرے گا۔ یعنی ان ذرائع کو خالق حقیقی کے احکامات سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی
جہاں چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اپنی ذات کو تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ کائنات کی
فطری نمو میں تعطل اور تہذیب وتمدن کی قدرتی نشوونما کے مطابق زندگی گزارے، اس کے رسولوں
کے بتائے ہوئے نظام زندگی کو اپنائے اور اپنے علم، صلاحیتوں اور قابلیتوں کو تہذیب وتمدن کی
بہترین ترقی کے لیے استعمال کرے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا اپنے آپ کو مستحق بنالے۔ گویا
نیابت الٰہی کا اصل مقصد بھی امتحان انسان ہی تھا۔ یعنی جتنا زیادہ اسے بااختیار بنایا جارہا ہے اتنا ہی
زیادہ اسے بڑے امتحان اور آزمائش میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی
وجہ بھی یہی آزمائش، آزادی اور اختیار ہے۔

ڈاکٹر محمد اسد، آدم کے زمین پر اتارے جانے کے بارے میں کچھ آیات قرآنی کی تفسیر
کرتے ہوئے انسان کے اختیار وانتخاب کی آزادی کو شرف انسانیت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے
ہیں:۔

" The growth of his consciousness symbolized by the wilful act of disobedience to God's command. It transformed him from a purely instinctive being into a full fledged human entity as we know it - a human being capable of discerning between right and wrong and thus of chosing his way of life. In this deeper sense, the allegory of the Fall does not describe a retrogressive happening but, rather, a new stage of human development; an opening of doors to moral considerations. By forbidding him to "approach this tree", God made it possible for man to act worngly with that moral free will which distinguishe

him from all other sentient beings."(۳۸)

یعنی خدا کی خوشنودی اور ناراضگی کا معیار خدا کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ انسان کو ایک حقیر مخلوق کے مرتبے سے بلند کر کے ایک باصلاحیت و باہنر جنس، اللہ تعالیٰ نے، بنایا ہے۔ جیسا کہا آج ہمارے سامنے ہے۔ ایک ایسی مخلوق جو خیر اور شر میں تمیز کی صلاحیت رکھتی ہے، اور اپنی زندگی کے لیے ایک راہ عمل متعین کر سکتی ہے۔ زیادہ وسیع معنوں میں، انسان کے جنت سے نکلنے کی تمثیل کا بیان، دراصل تنزلی کا بیان نہیں بلکہ انسانی ترقی کا ایک باب ہے۔ یہ تو ایک علامت ہے، کہ انسان کو اخلاقی معیار کس طرح پیش نظر رکھنا چاہیے جب انسان کو کہا گیا کہ وہ درخت کو نہ چھوئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو درخت کو چھو بھی سکتا ہے۔ یہ جو نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی قوت ہے، یہی جانوروں اور انسانوں میں سبب اختلاف ہے اور یہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔

خلافت اور نیابت دراصل ایک ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو سونپ کر اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشا ہے۔ گویا اس طرح اسے صفات الٰہیہ سے متصف کیا ہے۔ صوفیانہ زمانہ میں انسانیت کے اس شرف نیابت و خلافت کو مزید مبالغے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ سید مناظر احسن گیلانی، وحدۃ الوجودی انداز میں اس میں منصب انسانیت کو ذات الٰہیہ کا پرتو اور اسی کی ذات کا ایک مرکزی نقطہ قرار دیتے ہیں جو انسان کو عطا ہوا ہے۔ اس وجہ سے انسانیت کے مقام و مرتبہ اور قدر و منزلت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ یہاں تک کہ انسانیت پر الوہیت کا دعوکا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''اب تک خدا نے اپنے اسماء و صفات کو اپنے سے باہر فرض کیا یا پیدا کیا لیکن خود اپنی ذات کو اپنا غیر فرض کر کے کوئی مخلوق نہیں بنائی، یہی وہ ارادہ تھا جس کا اعلان ملائکہ کے سامنے ازل میں '' انی جاعل فی الارض خلیفة '' سے کیا گیا، اور یہی ہوا کہ صفات کے اس نسکہ جامعہ میں یا عالم صغیر میں خود اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر کے ''نفخت فیه من روحی '' کا اعلان کیا گیا اور جمادات کا خلیفہ بن کر آیا۔ پس شخص کبیر یا آفاق کے لیے جس طرح ایک روح یا نقطہ مرکزی، یا انا (خدا) تھا، اسی طرح اس شخص صغیر میں بھی ایک ایسا شعوری نقطہ پیدا ہو گیا۔ جس کو ہر شخص ہم میں سے انا یا میں

وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ جس میں وہ سارے شیون واوصاف ہیں جن پر شعوری یا غیر شعوری طور پر الوہیت کا دعوکا ہوتا ہے اور خدا جانے کتنوں کو ہوا ہے''۔(۳۹)

اللہ تعالیٰ نے الوہی صفات کے مظہر اس منصب نیابت کو قرآن میں ''امانت'' بھی کہا ہے اور اس طرح سے اسے بیان فرمایا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ امانت خلافت کوئی اختیاری چیز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہاڑوں آسمانوں اور زمین نے اس امانت کو بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا جبکہ انسان نے اس بار خلافت کو (اپنی مرضی سے) اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

انا عرضنا الا مانة علی السموات والارض و الجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلو ما جهو لا۔(۴۰)

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

جیسا کہ آیت کی عبارت سے ظاہر ہے، یہ ذمہ داری اختیاری تھی۔ پہاڑوں، آسمانوں اور زمین پر یہ امانت پیش کرتے وقت ان کو حکم نہیں دیا گیا کہ ضرور اٹھائیں، ایسی صورت میں خلاف ورزی ان سے ممکن نہ ہوتی لیکن یہ پیش کرنا بطور تجویز تھا۔ جس پر انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کر کے معذرت کر لی اور انسان نے اس شوق میں یہ ذمہ داری قبول کی کہ اس طرح اللہ کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ امانت اٹھانے کا انسان یہ فعل اختیاری تھا نہ کہ لازمی۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:۔

''الامانة الفرائض عرض الله علی السموات والارض والجبال ان ادوها اثابهم وان ضیعوها عذبهم فکرهوا ذلك واشفقوا علیه من غیر معصیة و لکن تعظیما لدین الله ان لا یقوموابها ثم عرضها علی آدم فقبلها بما فیها وهو قوله تعالیٰ(و حملها الانسان انه کان ظلو ماً جهو لا) ای غرابا مرا لله''۔(۴۱)

یعنی امانت سے مراد فرائض ہیں۔ جب دوسری مخلوقات کے سامنے یہ ذمہ داری (امانت) پیش کی گئی تو یہ بطور تجویز کے تھی، حکم کے نہیں۔ پس ان کا انکار اور ذمہ داری قبول کرنے سے معذوری کا اظہار اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قوتوں اور اس کی شان کا اظہار تھا کہ اپنی تمام تر قوتوں کے باوجود وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری سے بخیر وخوبی عہدہ برآنہ ہو سکے تو بالکل ہی تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ جبکہ انسان نے اپنی معصومیت اور اللہ کے قرب کی خواہش کی بدولت یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

اس کا مطلب ہے کہ اختیار، ارادہ اور آزادی پر مبنی اس ذمہ داری کا آغاز اور اطلاق بھی آزادانہ اختیار کے تحت ہوا ہے۔ اسی آزادی اختیار کیوجہ سے یہ امانت انسان کی ایک بہت بڑی ذمہ داری اور آزمائش بن گئی ہے۔ جس کے بارے میں اسے اپنے رب کے ہاں جواب دینا پڑے گا۔ سید مودودیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس ذمہ داری کی نوعیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس جگہ ''امانت'' سے مراد وہی ''خلافت'' ہے جو قرآن مجید کی رو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اطاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں، ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرز عمل پر اجر کا اور غلط طرز عمل پر سزا کا مستحق ہے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کو ''خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انہی کے لیے ''امانت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کے اٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البنیان نے اپنی ذرہ سی جان پر یہ بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے۔ زمین و آسمان کے سامنے اس بار امانت کا پیش کیا جانا اور ان کا اسے

اٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا، ہوسکتا ہے کہ لغوی معنی میں ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارگراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اٹھے ہوں۔ اور انہوں نے اپنے مالک وخالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں اپنی خیر پاتے ہیں۔ ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اس کا حق ادا کرسکیں۔ اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کرسکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرہ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کرسکتا ہے جو اپنے ذہن وفکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔ البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو۔ اور صورت معاملہ کی غرض معمولی اہمیت کا تصور دلانے کے لیے اس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین وآسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف پانچ چھ فٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ”میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا ورغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے، ورنہ وہ میرا انکار بھی کرسکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اس سے اس طرح چھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔ اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا۔ اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا۔ تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے، کرسکے۔ اس کے بعد

میں ایک وقت خاص پر اس کا حساب لوں گا۔ جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے۔ اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرمانبرداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئی ہیں۔ اب بتاؤ تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے"۔ یہ تقریر سن کر پہلے تو ساری کائنات میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اسے اس کڑے امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اونچا عہدہ مل جانے کی جو امید ہے اس کی بناء پر میں ان سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو آزادی و خود مختاری میں پوشیدہ ہیں"۔ (۴۲)

اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کو آزادی عطا کر کے اعمال کے بارے میں مقلد ٹھہرا دیا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی جو ہمارے سامنے ہے، اس کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ جس کے اچھے اور برے ہونے کا دارومدار اس موجودہ زندگی جو ہمارے سامنے ہے، گویا یہ زندگی میدان عمل ہے اور بعد میں ایک زندگی جزا و سزا کی ہے۔ یہ تصور انسانی فطرت میں ایک طرح کی امید، عزم، ذوق اور ایک انقلابی روح پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہی جدوجہد اسے انسانیت کے مقام اشرف پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اور انسان اپنے مقصد تخلیق پر پورا اترتا نظر آتا ہے۔ اگر ذاتی کردار، جدوجہد اور اعمال کی بناء پر آئندہ زندگی میں بہتر انجام کا تصور ختم کر دیا جائے تو انسانی فطرت مایوسی کا شکار ہو جائے۔

قبل از اسلام معاشرے کے اندر ایسی ہی جہالت اور مایوسی پھیلا دی گئی تھی۔ کسی نے انسان کو پیدائشی گناہگار قرار دے کر مایوسی کے اندھیروں میں دھکیلا، اور کسی نے تناسخ ارواح کا نظریہ پیش کر کے انسان کو جنم جنم کی قید میں مبتلا کر دیا۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے انسانیت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے اسے آزادی، خودمختاری، تکلیف اعمال اور اخروی زندگی میں عذاب یا ثواب کا تصور دیا۔ اور اس طرح انسان کی خود اعتمادی کو بحال کیا۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ انسانی زندگی کے بارے میں آزادی، خود اعتمادی، جوابدہی اور اخروی نجات و ابتلاء کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے

انسانیت کے لیے عظیم خوشخبری قرار دیتے ہیں:۔

''انسانی تہذیب کو اسلام کی پانچویں عطا اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس سے پہلے نوع انسانی کے اکثر افراد اللہ کی رحمت عامہ وتامہ سے مایوس اور انسان کی سلامتی فطرت کی طرف سے بدگمان تھے۔ اور اس مخصوص ذہنی فضا کے پیدا کرنے میں بعض قدیم مشرقی مذاہب اور یورپ وشرق اوسط کی محرف مسیحیت کا بڑا ہاتھ تھا۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب تناسخ (آواگون) کے عقیدہ وفلسفہ کے قائل تھے۔ جس کے ہوتے ہوئے، انسان کے ارادے اور خود مختاری کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کی روح سے ہر انسان اپنے پچھلے کرتوتوں کی سزا بھگتنے پر مجبور ہے۔ اور وہ درندہ بن جاتا ہے، کبھی چرنے والا یا کوئی ادنیٰ جانور یا کوئی بدنصیب اور مبتلائے عذاب انسان کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ عیسائیت نے اعلان کیا کہ انسان پیدائشی وفطری گناہگار ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام اس کے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ اس عقیدہ نے دنیا کے لاکھوں کروڑوں متمدن مسیحیوں کو اپنے بارے میں بدظنی اور اللہ کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ مایوسی کے ایسے عالم میں پیغمبر انسانیت ﷺ نے پوری قوت وصراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ انسانی فطرت ایک صاف شفاف تختی ہے، جس پر کوئی تحریر نہیں۔ اور اب اس میں کوئی دلپذیر نقش یا کوئی خوش نما تحریر لکھی جاسکتی ہے۔ اور انسان اپنی زندگی پانے ارادہ سے شروع کرتا ہے اور اپنے عمل کے نتیجے میں ثواب وعذاب اور جنت وجہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے اور وہ کسی اور کے عمل کا جواب دہ نہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے کہ انسان صرف اپنے عمل کا ذمہ دار اور اپنی جہد و سعی کے نتیجہ کا مستحق ہے۔ اس اعلان نے انسانوں کو اس کی فطرت پر کھویا ہوا اعتماد لوٹا دیا اور وہ عزم مصمم، ذوق وشوق، اور جرات وپامردی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ تاکہ اپنے مقدر اور انسانیت کے مستقبل کو سنوار سکے اور ان عظیم امکانات اور قیمتی لمحات میں اپنی قسمت و طاقت کا تجربہ کر سکے''۔ (۴۳)

یعنی اس دارالعمل (دنیا) میں انسان اپنی سعی اور کوشش میں آزاد اور خودمختار ہے۔ اور یہ اختیار اللہ کا عطا کردہ ہے۔ پھر اس کے بعد اسلام ایک آخرت کی زندگی ''دارالجزا'' کا تصور دیتا ہے۔ جو کہ نیکی وبدی کے اور انسان کی تمام فکری وعملی کوششوں کے بدلے کا گھر ہے۔ ''دارالعمل'' سے''

دارالجزاء'' کی طرف منتقلی (موت) تک انسان کو اپنی مرضی سے اعمال سرانجام دینے کی مہلت اور آزادی ملی ہوئی ہے۔اس کے بعد اعمال میں مہلت اور آزادی کی یہ نعمت سلب کر لی جائے گی۔ انسان کو جس حد تک بھی اختیار و آزادی حاصل ہے وہ اس دینوی زندگی میں محض آزمائش کی خاطر ہے۔جس کا نتیجہ آخرت میں بہت جلد نکلنے والا ہے۔گویا فکر و عمل میں انسانی آزادی و اختیار و جواب دہی اور ذمہ داری کو مستلزم ہے۔اس اخروی زندگی کے تصور نے اعمال کے حوالے سے انسان کی ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔جہاں انسان کو اس کے دینوی اعمال میں سے ہر چھوٹے بڑے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

و اتقو یو ما تر جعون فیه الی الله ثم تو فی کل نفس ما کسبت و هم لا یظلمو ن۔(۴۴)

اور اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کے پاس واپس کیے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اپنی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔یہ جواب دہی کی ذمہ داری ہر انسان پر انفرادی طور پر لاگو ہوتی ہے۔کوئی شخص اپنے ذاتی اعمال کی جوابدہی اور ان کے حساب و کتاب سے فرار حاصل نہیں کر سکے گا۔اور نہ ہی اپنے اعمال کے وبال میں یا ثواب و عذاب میں کسی اور کو شریک کر سکے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

و لا تکسب کل نفس الا علیها و لا تزر وازرة وزرا خری۔(۴۵)

اور نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ (ذمہ داری) اسی پر ہے اور کوئی (ذمہ دار) کسی دوسرے (کی ذمہ داری) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

سید مودودیؒ انسان کے ذمہ دارانہ تصور زندگی کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:۔

''یہاں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور برے اعمال کی کامل ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا،نہ اس توقع کے لیے کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائیں گے۔اور نہ اس خطرہ کا کوئی موقع باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن

نتائج پر اثر انداز ہوگا یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے جلنے سے کوئی چیز نہیں بچاسکتی، اور شہد کھانے والے کو شیرنی کے احساس سے کوئی شے نہیں روک سکتی، نہ جلنے کی مضرت میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک و سہیم ہوسکتا ہے، اور شیرینی کی لذت سے کوئی دوسرا اس کو محروم کرسکتا ہے، اسی طرح بدکاری کے نتیجہ بد اور نیکوکاری کے انجام نیک میں بھی ہر شخص بجائے خود منفرد ہے۔ لہذا دنیا کو برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں، برائی کا وبال بھی تنہا میرے اوپر ہے اور بھلائی کا فائدہ بھی اکیلا میں اٹھانے والا ہوں''۔(۴۶)

معلوم ہوا کہ اسلام انسانی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ دوجہتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اسے دوحیاتی نظریہ کہا جاسکتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی، اس کے اعمال، فکر و تدبر ذمہ داریوں، پابندیوں اور آزادیوں کا تصور محض اس دنیوی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہاں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کا دائرہ ایک اور زندگی، جو اس زندگی سے زیادہ حقیقی اور وسیع ہے، تک وسعت رکھتا ہے۔ اس دنیوی زندگی کا اخروی زندگی سے اتنا گہرا اور لازمی تعلق ہے جتنا امتحان اور نتیجہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر نتائج کا تصور ''امتحانات'' سے خارج اور الگ کر دیا جائے تو امتحان کے کوئی معانی باقی نہیں رہتے۔ بالکل اسی طرح اخروی زندگی کا تصور دراصل اس دنیوی زندگی کے تصور کو مقصد اور مفہوم عطا کرتا ہے۔ اسلام کا یہ دوحیاتی نظریہ انسان کے اس زندگی کے بارے میں رویے اور اس کے فکر و عمل اور سوچ و تدبر کو نئی اور درست سمت مہیا ہو جاتی ہے۔ محمد قطب انسان کے دوحیاتی نظریہ کی افادیت کا تذکرہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

''جب انسان یہ سمجھتا لیتا ہے کہ یہی زندگی تمام کچھ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی زندگی ہے تو ایک طرف تو وہ زندگی کی لذتوں پر مجنونانہ نہیں لپکتا۔ جیسا کہ انسان کے ذہن میں اگر یہ تصور ہو کہ یہی زندگی ہے۔ جو کچھ ہے، اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور جو کچھ لوٹا جاسکے لوٹ لیا جائے۔ دوسری جانب انسان اسلام کے دوحیاتی نظریہ کی بنا پر قنوطیت اور محرومیت کا شکار ہونے سے

بچ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان جب دنیا کے مظالم اور بگاڑ دیکھتا ہے، دینا کی بے چینی اور عذاب کا مزا چکھتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب حالات کی قطعاً کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی، نہ ان مظالم کا کوئی صلہ ہو سکتا ہے اور نہ اس بدبختی سے کوئی راہ فرار ہے۔ تو انسان بجائے اس کے کہ ان حالات کا مقابلہ کرے، ہتھیار ڈال دیتا ہے اور خود قنوطیت ومحرومیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام کے دوحیاتی نظریے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ انسانی ضمیر تباہ نہیں ہوتا۔ حق وانصاف پر سے اس کا ایمان ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے عمل واخلاق بگاڑ کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اگر انسان اس نظریہ کو نہ مانے تو ظلم کرتا ہے اور ظلم سہتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے ہر ذریعہ اختیار کرتا ہے جبکہ نہ ذریعہ پاکیزہ ہوتا ہے اور نہ مقصد چوتھا فائدہ یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرتا رہتا اور اللہ سے پاک وصاف ملاقات کے لیے اپنے تمام اعمال میں پاکیزگی برتتا ہے۔ اس لیے اسلام آخرت کے ذکر پر ذور دیتا ہے اور آخرت کے مناظر بیان کرتا ہے اور اخروی زندگی کا دنیاوی زندگی سے رابطہ بتاتا ہے اور یہ کہ دنیا ہی اخروی زندی کا ایک واحد ذریعہ ہے۔ اور آخرت میں صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے دنیاوی زندگی کو صحیح اور درست بنیادوں پر قائم کرنا پڑے گا۔ اسلام انسان کو ایک انوکھی اور بدیع شکل میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام بتاتا ہے کہ انسان نہ الٰہ ہے، نہ حیوان اور شیطان ہے، انسان صرف انسان ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں ممتاز و بلند مرتبہ دے کر اور اپنا خلیفہ بنا کر پیدا فرمایا ہے"۔ (۴۷)

انسان کی اسلامی تعبیر، منصب خلافت، آزادی واختیار، امانت و ذمہ داری اور مقصد تخلیق انسانیت، سب اس طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ انسان بتقاضائے منصب آدمیت، آزمائش میں مبتلا ہے۔ جس کے نتائج عنقریب ایک دوسری زندگی (اخروی زندگی) میں حاصل ہونے والے ہیں۔ پر آسائش یا پر مصیبت اخروی زندگی (کی آسائشوں یا مصیبتوں) کا انحصار اسی آزمائش پر ہے۔ اس آزمائش میں انسان صرف اس وقت پورا اتر سکتا ہے جب یہ دنیوی زندگی خالق کی مرضی کے مطابق مقصد تخلیق کے تقاضے پورے کرتے ہوے بسر کرے۔ گویا انسان اپنے تمام تر اختیارات اور آزادیوں کے باوجود اور کائنات میں قوت تسخیر حاصل ہونے کے باوجود، اپنے خالق و مالک کی ذات کے سامنے مجبور ہے۔ اس کے سارے شرف اور ساری عظمتوں کا راز اسی ایک ذات کے سامنے

عاجزی وانکساری اور مجبوری و بے بسی (جیسا کہ حقیقت میں ہے) کے اظہار میں مضمر ہے۔ انسان جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی غلامی میں کامل استغراق کے ساتھ عجز وعبادت میں سرگرم عمل ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ کائنات ارضی کی تسخیر اور آزادی واختیار کا حقدار ٹھہرے گا۔ یعنی یہ اختیار ایک پہلو کے اعتبار سے انسانی مجبوری بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ رشتہ عبدیت جس حد تک پختہ اور کامل ہوگا انسانی عظمت و شرف میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ انسان جبر واختیار کے دو مختلف دائروں کے درمیان میں ایک مرکزی نقطہ ہے جس کا دونوں دائروں کے ساتھ اعتدال پر مبنی تعلق ہی انسانیت کی معراج کا ذریعہ قرار پا سکتا ہے۔ مالک کی رضا مندی کے مطابق زندگی گزارنے کا جبر، اور کائنات پر بطور نائب خدا حکومت کرنے کا اختیار، اور نعمت ہائے خداوندی کا اسی کی مرضی کے مطابق بھرپور استعمال انسانی زندگی کو حقیقت کا روپ عطا کرتے ہیں۔ اور یوں جبر واختیار کے درمیان گھرا ہوا انسان اخروی امتحان میں حصول کامیابی کے لیے کوشاں اپنے مقصد تخلق پر پورا اترتا نظر آتا ہے۔

سید مناظر احسن گیلانی انسان کے اسی مقصد تخلیق کو ''بتلاء بالعبدیت'' قرار دیتے ہیں۔ اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسانی زندگی میں یہ جبر واختیار کا حسین امتزاج عین فطری اور مقاصد تخلیق انسانی کے عین مطابق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''فطرت انسانی کا یہی جبر نما اختیار ہے جو بالآخر آدمی کو اس مقصد تک خود پہنچا دیتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا، مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں اختیار اور اس کی وسعت کے امکانات کا احساس ہم میں آرزوؤں اور تمناؤں کے طوفان برپا کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف ہمارے محدود اختیارات، ہماری نارسائیاں اور تمناؤں کی شکست اور ناکامیاں مجبور کرتی ہیں کہ غریب انسان اپنی ذلت کی پیشانی کسی کے آگے جھکا دے اور سوال یا بھیک کا ہاتھ کسی کی طرف اٹھائے۔ اسی کو عبادت اور دعا کہتے ہیں، اسی کی مختلف شکلوں اور بھیسوں کا نام نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ہے۔ کس کے آگے جھکے؟ کس سے مانگے؟ بلاشبہ اس میں بنی آدمؑ کے مختلف طبقات مختلف رہے ہیں۔ لیکن نفس جھکنے اور مانگنے سے تو عموماً کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور یوں یہ اہم سوال کہ ''عالم کو خدا نے کس لیے پیدا کیا؟'' اس سوال کا زندہ جواب بن کر وہی ہستی سامنے آجاتی ہے جو خلافت کے

قالب میں خدائی کمالات لے کر پیدا ہوئی تھی اور اب بندہ بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ''خلافت'' اور ''عبدیت'' کی یہی کشمکش ہے جس نے انسان کی اس ارضی زندگی کو آزمائش اور ابتلا کی زندگی بنادیا ہے۔ الغرض اب جا کر فطرت انسانی کے پیچ در پیچ قوانین نے **ماخلقت الجن و الانس الا لیعبدون** (۴۸) کی تفسیر کردی، اور واقع بھی یہی ہے کہ اس کن فیکونی کائنات کا ہر ذرہ رب قیوم سے جب مسلسل عمل تخلیق اور التفات و توجہ کا محتاج اور دست نگر ہے تو اس میں یہ مختار نما مجبور انسان اگر کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہی کہ اپنے اختیارات کو بجائے ناقص علوم اور ناقص تجربوں کے، علم محیط کلی کے ماتحت کردے یعنی خدا کے بتائے ہوئے قانون کو اپنے اوپر عائد کرنے اور خود **ایاك نعبد و ایاك نستعین** (۴۹) کہتے ہوئے اس کے آگے جھک جائے جس کے سامنے جھکنے کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ اسی سے ہر معاملہ میں صراط مستقیم کی طلب گار ہو جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ وہ اسی لیے پیدا ہوا ہے اور وہ سوچے تو اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا، بلکہ انسان اپنے وجود کا مقصد اس (عبدیت) کے سوا کچھ نہیں بتا سکتا۔ عبدیت کے مقام سے ہٹ جانے کے بعد معلوم ہو چکا ہے کہ انسان پھر کسی مقام پر ٹھہر کر اپنی ہستی کو کارآمد اور نظام کائنات کا مفید جز ثابت نہیں کر سکتا''۔ (۵۰)

انسان کی یہی مجبوری ہے جس کی بنا پر اس کی آزادی، مادر پدر آزادی نہیں ہو سکتی اور اس کا اختیار، بے مہار اور مطلق العنان نہیں ہو سکتا۔ فطرت انسانی اور اس کے مقصد تخلیق کے تحفظ کے لیے اس کی آزادی و اختیار کو محدود کرنا ہی انسان کے مفاد میں ہے۔ انسانی زندگی کا فطری اور حقیقی تصور ہی ان پابندیوں اور مجبوریوں کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ اشرف الخلوقات انسان انہی فطری حدود اور مجبوریوں کی بدولت اپنے خالق و مالک اور اس وسیع و عریض کائنات کے درمیان اپنا وجود، اور اعتدال پر مبنی تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔ ورنہ اگر اس کی ان تمام فطری پابندیوں سے یکسر آزاد تصور کر لیا جائے تو اس کائنات کے اندر انسان کی حیثیت میں ہی تبدیلی واقع ہو جائے گی۔ خدا اور انسان کے تعلق میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ اور رشتہ عبودیت کے انقطاع و بگاڑ کے ساتھ ہی اس کائنات کے حوالے سے انسان کے شرف و عظمت کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہے گا۔

حواشی

١ (١٩) اسلامی نظریہ حیات، ص ٨

٢ (٢٠) القرآن الحکیم، (الدھر) ٧٦:١

٣ (٢١) سید قطب شہید، فی ظلال القرآن (مترجم میاں منظور احمد)، اسلامی اکیڈمی لاہور،
١٩٨٩ء، ج ١٠ ص ٤٠١

٤ (٢٢) القرآن، الحکیم، (الحج) ٢٢:٥

٥ (٢٣) وحید الدین خان، عقلیات اسلام، فضلی سنز لمیٹڈ کراچی، ١٩٩٢ء، ص ٨

٦ (٢٤) القرآن الحکیم، (بنی اسرائیل) ١٧:٦٧ تا ٦٩

٧ (٢٥) ایضا، (النساء) ٤:٢٨

٨ (٢٦) مودودی، ابوالاعلیٰ سید، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، اسلامک
پبلیکیشنز لاہور، ١٩٩٧ء،
ص ١٨_١٩

٩ (٢٧) القرآن الحکیم، (بنی اسرائیل) ١٧:٧٠

١٠ (٢٨) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، ١٩٩٣ء، ج ٥، ص ٥٠٦

١١ (٢٩) آلوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی،
داراحیاء التراث العربی بیروت، س ن، ج ١٥، ص ١١٨

١٢ (٣٠) Siddiqui, Bashir Ahmad, Dignity of man in Islam,
Siddiqui pulications Lhr., 1996, P10

١٣ (٣١) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ٥٥

١٤ (٣٢) خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، المکتبۃ العلمیۃ لاہور، ١٩٧٨ء، ص ٥٣_٥٤

١٥ (٣٣) القرآن الحکیم، (الحج) ٢٢:٧٣

١٦ (٣٤) ندوی، ابوالحسن علی سید، تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات، مجلس

نشریات اسلام کراچی،

۱۹۸۶ء، ص ۲۲۔۲۴

۱۷ (۳۵) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۵۵۔۵۶

۱۸ (۳۶) القرآن، (البقرہ) ۲: ۳۰۔۳۳

۱۹ (۳۷) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، دارالاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۱۱۳۔۱۱۴

۲۰ (۳۸) Muhammad Asad, The Message of The Qur'an, Dar Al-Andalas Gibralter, 1980, p205.

۲۱ (۳۹) مناظر احسن گیلانی، الدین القیم، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۵۱

۲۲ (۴۰) القرآن الحکیم، (الاحزاب) ۳۳: ۷۲

۲۳ (۴۱) ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، المکتبۃ المکیۃ، ۱۹۴۸ء، ج ۳، ص ۵۲۲

۲۴ (۴۲) تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۲۵ (۴۳) تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات، ص ۷۹۔۸۰

۲۶ (۴۴) القرآن الحکیم (البقرہ) ۲: ۲۸۱

۲۷ (۴۵) القرآن الحکیم (الانعام) ۶: ۱۲۴

۲۸ (۴۶) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۴۵

۲۹ (۴۷) جدید جاہلیت، ص ۲۱۷۔۲۱۸

۳۰ (۴۸) القرآن الحکیم، (الذاریات) ۵۱: ۵۶

۳۱ (۴۹) القرآن الحکیم، (الفاتحہ) ۱: ۴

۳۲ (۵۰) الدین القیم، ص ۱۹۲ تا ۱۹۵

****